بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اداریہ

خطرناک موڑ

بلال عبدالحی حسنی ندوی

کامیاب قومیں تاریخ سے سبق لیتی ہیں، وہ تاریخ کو الٹا سفر نہیں کراتیں بلکہ تاریخ کی روشنی میں آگے بڑھتی ہیں اور ترقی کرتی چلی جاتی ہیں، یورپ کی موجودہ ترقی میں بھی اس کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے، اس نے صدیاں تاریکی اور جہالت میں گزاری ہیں پھر اس نے مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا، ان کے عروج کے اسباب کا جائزہ لیا اور اس کو سامنے رکھ کر حکمت عملی میں تبدیلیاں لانی شروع کیں۔ جن لوگوں نے قوموں کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ یورپ کی ترقی کی بنیاد مسلمانوں کے فراہم کیے ہوئے سرمایہ پر ہے، پھر مسلمانوں نے الٹا سفر شروع کردیا اور یورپ نے مسلمانوں کے اس سرمایہ پر اپنی ترقی کی جو مضبوط بنیاد رکھی تھی وہ اس میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ دنیا میں قوموں کے عروج وزوال کے قصے نئے نہیں ہیں، یہ سلسلہ ہمیشہ سے رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا، زمانہ کا الٹ پھیر خالق کائنات کی قدرت کا ایک مظہر ہے۔

ہمارا ملک ایک قدیم اور مختلف خصوصیات رکھنے والا ملک ہے، یہ مختلف رجواڑوں میں بٹا ہوا تھا، مسلمانوں نے آکر اس کو ایک وسیع وعریض ملک کی شکل دی، تہذیب وثقافت سے اس کو مالا مال کیا، سیکڑوں سال انہوں نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی اور اس کی خدمت کی، پھر حالات بدلنے شروع ہوئے، انگریزوں نے ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے نام سے یہاں اپنے قدم جمانے شروع کیے، حکمرانوں کی غفلت کے نتیجہ میں آہستہ آہستہ وہ اس ملک پر قابض ہوگئے، ایک زمانہ یہاں کے باشندوں کو انگریزوں کی غلامی میں گزارنا پڑا، لیکن یہ غیر طبعی صورت حال چلنے والی نہیں تھی، یہاں کے اعلیٰ دماغ رکھنے والے خاندانوں نے آزادی کا بگل بجایا اور یہ ملک آزاد ہوا، انگریز اس ملک سے چلے گئے لیکن خود انگریز مؤرخ نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ ہم نے جاتے جاتے یہاں کی ایسی تاریخ مرتب کردی ہے جس سے ہندو اور مسلمان کبھی مل نہیں سکتے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آزادی کے فوراً بعد پورے ملک نے خون کی ہولی کھیلی اور دشمنوں کی سازش کے نتیجہ میں بھائی نے بھائی کا گلا کاٹا، آہستہ آہستہ لوگوں کو ہوش آیا اور ملک کے حالات بہتر ہوئے، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب تک اندر کا انتشار باقی ہے کوئی ملک ترقی نہیں کرسکتا۔

اس وقت ملک کے قائدین کی ایک بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ یہاں کی آبادی کو متحد رکھنے کی پوری کوشش کی جائے اور کوئی بھی ایسا اقدام نہ کیا جائے جس سے آپس میں دراڑ پڑتی ہو، دوسری اہم ترین بات یہ ہے کہ دشمنوں کی سازشوں پر نگاہ رکھی جائے۔

ابھی بعض انگریزی اخبارات میں ایسی خبریں آئیں ہیں، جو کان کھڑے کردینے کے لیے کافی ہیں، پہلے بھی 'پیام عرفات' کے صفحات میں اس سے خبردار کیا جاچکا ہے، جس طرح ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے نام سے انگریزوں نے یہاں قدم جمائے تھے اسی طرح یہودیوں نے آہستہ آہستہ اس ملک میں قدم جمانے شروع کردیے ہیں اس کی پوری تفصیلات بعض اخبارات میں آچکی ہیں، اس ملک میں یہودیوں کا قدم جمانا انگریزوں کے قدم جمانے سے زیادہ خطرناک ہے، یہودیوں کا کام ہی قوموں کو لڑانا اور حکومت کرنا ہے، دنیا کی قومیں اس کا تجربہ کرچکی ہیں، امریکہ اس کی وجہ سے گھٹن محسوس کررہا ہے اور وہ اندر سے ان سے چھٹکارا چاہتا ہے، یہودیوں نے اپنے لیے نئی زمین کے طور پر ہندوستان کا انتخاب کیا ہے، یہ ملک کی تاریخ کا ایک خطرناک موڑ ہے، کہیں خدانخواستہ وہی تاریخ دہرادی جائے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالہ سے دہرائی جاچکی ہے، پھر اس کے نقصانات پورے ملک کو کیا بھگتنے پڑیں گے، اس کے بارے میں تاریخ ہمیں بہت کچھ بتاتی ہے، اس وقت ملک کے قائدین کو بہت سوچنے اور بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ اگلی نسلیں شاید ان کو معاف نہیں کرسکیں گی۔

یہ ملک کے لیے نازک مرحلہ ہے، اس میں تھوڑی سی غفلت ملک کو دوبارہ غلامی کے اندھیرے غار میں ڈھکیل سکتی ہے، افسوس کی بات ہے کہ جس طبقہ کو اس کی سب سے زیادہ فکر ہونی چاہیے اور اس کو ملک کا مفاد سب سے زیادہ عزیز ہونا چاہیے وہی طبقہ آج ذاتی یا اجتماعی مفاد کے حصول کے لیے سب کچھ داؤں پر لگانے کے لیے تیار ہے، اس سلسلہ میں بہت سے حقائق سامنے آچکے ہیں، ان پر کتنا ہی پردہ ڈالا جائے لیکن حقیقت بدلی نہیں جاسکتی، شترمرغ کی طرح ریت میں سر دے کر خیریت کا لفظ ہزار بار دہرانے سے خیریت نہیں ہوا کرتی، حقیقت پسندانہ تجزیہ (Analysis) کرنے کی ضرورت ہے اور یہ ذمہ داری ہے ملک کے قائدین کی جن کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور ہے۔

ماہنامہ
پیام عرفات
رائے بریلی

مرکز الإمام أبي الحسن الندوي

جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۱۱
نومبر ۲۰۰۹ء / ذیقعدہ ۱۴۳۰ھ

سرپرست
حضرت مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ
(صدر، دارِ عرفات)

نگران
مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی مدظلہ
(جنرل سکریٹری، دارِ عرفات)
مولانا احمد علی حسنی ندوی مدظلہ
(ڈائریکٹر، دارِ عرفات)

مجلس ادارت
بلال عبدالحی حسنی ندوی
مفتی راشد حسین ندوی
عبدالسبحان ناخدا ندوی
محمود حسن حسنی ندوی
محمد حسن ندوی

معاون ادارت
محمد نفیس خاں ندوی

فی شمارہ: ۷ روپے سالانہ: ۷۰ روپے
اعزازی (سالانہ) ۵۰۰ روپے

مرکز الامام أبي الحسن الندوي
دار عرفات، تکیہ کلاں
رائے بریلی (یوپی) ۲۲۹۰۰۱
E-Mail: alnadwi@yahoo.com

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر ''پیام عرفات''، مرکز الامام أبي الحسن الندوي، دارِ عرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

ہمارا کردار غیر مسلموں میں

مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

مسلمانوں کی اجتماعی زندگی، دعوت کے عمل اور جہاد کے عمل پر مشتمل ہے اور دونوں کے لیے جناب رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ سے پوری روشنی ملتی ہے اور اسی سے رہنمائی اور طاقت حاصل کرنا ہے، اپنے ذاتی رجحان پر نہیں لیکن عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ غیروں سے ہم کو جو تکلیفیں پہنچیں، اور طاقتور دشمنوں سے جو اذیتیں پہنچیں، انہوں نے ہم میں ایک ردعمل پیدا کردیا جو انتقامی جذبہ کی صورت میں جگہ جگہ ظاہر ہورہا ہے، انتقام لینا ہر مظلوم کا حق ہے اور اگر مظلوم میں انتقامی کیفیت پیدا ہوئی تو اس کے اس طرز عمل کو بغاوت کی بات سمجھی جائے گی، اور مظلوم کو اسلام کی طرف سے انتقام کا پورا حق دیا گیا ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ صحیح نہیں کہ انتقامی جذبہ میں خطا کار اور بے خطا کار کا کوئی فرق نہ کیا جائے، اور ظالم سے غصہ ہوکر اس سے تعلق رکھنے والے ایسے شخص پر بھی غصہ اتار دیا جائے جس نے ظلم نہیں کیا، پھر یہ دیکھنا عقل کی بات ہے کہ انتقام لے لینے اور غصہ اتار لینے کے علاوہ بھی کوئی دوسری بات نفع بخش ہوسکتی ہو تو اس پر بھی غور کیا جائے اور اختیار کرنے کے لائق ہو تو اختیار کیا جائے، اور ظالم کا مطالعہ کیا جائے، اور یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ اس کے ظلم کے نیچے کوئی ایسا سبب تو نہیں جس کا تعلق ہماری کسی کمزوری یا غلطی سے ہو۔

نبی آخر الزماں حضور ﷺ نے دین کا کام دعوت سے شروع کیا، اور دعوت میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور وحدانیت کو تسلیم کرایا اور بندگی کے تقاضے پورا کرنے کے ساتھ ساتھ عام انسانی ہمدردی اور مکارم اخلاق کو وطیرہ بنایا، یہی وجہ تھی کہ لوگوں کو آپ کی دعوت سے اختلاف بلکہ مخالفت کے باوجود آپ سے ہمدردی تھی جو آپ کو امانت دار، سچا، اور نیک طبیعت سمجھنے کے واقعات سے ظاہر ہے۔ ابوجہل نے ایک بار آپ کو سخت زبانی ایذا پہنچائی، آپ نے موقع ایسا محسوس کیا کہ سخت لفظ استعمال فرمائے، آپ نے فرمایا کہ میں وہ بات لایا ہوں کہ جس کے ذریعہ تم لوگ کٹو گے، اس پر لوگ یہ کہنے لگے، محمد صاحب آپ تو نادرست اور ناگوار رویہ اختیار نہیں کیا کرتے تھے، یعنی دشمنوں نے شہادت دی کہ آپ کا رویہ عموماً صبر کا رہا۔

آپ جہاں نرم اور متحمل تھے کہ آپ کے دشمن بھی یہ کہیں کہ آپ ایسا سخت رویہ اختیار نہیں کیا کرتے تھے وہاں یہ بات بھی تھی کہ جہاد وقتال کا موقع آیا تو آپ نے اپنے ہاتھ سے بھی ضرب وقتال کیے، اور اس میں کوئی ڈھیلا پن اختیار نہیں کیا، آپ کی مکی زندگی اپنا علاحدہ رنگ رکھتی ہے اور مدنی زندگی علاحدہ رنگ، اور دونوں میں کبھی کبھی وہ لمحات بھی آئے جس میں طرز مختلف ہوجاتا، یہ سب موقع ومحل کا لحاظ رکھنے اور مقصد پر نظر رکھنے سے ہوتا تھا، چنانچہ طائف جب آپ ہمدردی حاصل کرنے کے لیے تشریف لے گئے اور وہاں ہمدردی نہیں ملی بلکہ نہایت غیر انسانی طریقہ سے آپ کو مایوس کیا گیا اور اذیت پہنچائی گئی تو اس پر خدائے تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی اور ایک فرشتہ بھیجا گیا کہ آپ کہیں تو پہاڑوں کے درمیان یہ رہتے ہیں پہاڑوں سے دبا دیے جائیں، آپ نے دکھے دل کے باوجود یہ فرمایا کہ نہیں! اگر یہ نہیں تو ان کی اولاد حلقہ بگوشِ اسلام ہوجائے گی۔

ہم اگر مسلمانوں کے درمیان رہ رہے ہیں تو ہماری کیا ذمہ داری ہے؟ اور اگر غیر مسلموں کے درمیان ہیں تو ہماری کیا ذمہ داری ہے؟ رواداری برتنے کے حالات کون سے ہیں اور انتقامی جذبہ اختیار کرنے کے کون سے ہیں؟ پھر یہ دیکھنا کہ محض دشمن کی شر پسندی سے حالات میں خرابی ہے یا ہماری کوتاہی اور بے توجہی کو بھی دخل ہے، ان باتوں پر نظر رکھتے ہوئے طریقۂ عمل اختیار کرنا سمجھداری ہے۔

ان باتوں کا اگر ہم منصفانہ جائزہ لیں تو کم از کم ہندوستان کے اس ملک میں ہماری کوتاہی کا بھی اچھا خاصا حصہ نکلے گا، ہم نے اسلام کی تعلیمات کو واضح کرنے اور مسلمانوں کی انسانیت دوستی کے کردار کا مظاہرہ کرنے میں بڑی کوتاہی کی ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ بعض وقت ہم کو اپنے پڑوس میں کئی کئی دہائی تک غیر مسلموں سے واسطہ پڑا ہے لیکن ان کو یہ تک نہیں معلوم ہوتا کہ اسلام میں غیر مسلموں کے ساتھ کیا کردار بتایا گیا ہے، اس کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اسلام کا موٹا موٹا مطلب کیا ہے، اس کے برعکس اس کو مسلمانوں سے خوف معلوم ہوتا ہے، اس نے صرف یہ سنا ہے کہ مسلمانوں کے اسلاف صرف مار دھاڑ کرتے رہے، اور اب ان کے یہ اخلاف بھی کچھ ایسے ہی خطرناک جذبات کے لوگ ہیں، پھر ان کے لیڈر اور بھی جھوٹی سچی باتیں بتا کر ان مسلمانوں کو بالکل مشکوک بنا کر نفرت سے دل بھر دیتے ہیں، ایسی صورت حال میں کیا ہماری یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ ہم اپنے غیر مسلم پڑوسیوں کو اسلام کے متعلق اور مسلمانوں کے متعلق بتائیں؟ ان کی صحیح تصویر ان کے سامنے رکھیں اور ان کے ذہنوں میں اسلام کے بارے میں ایک اعلیٰ تصور پیدا کرنے کی کوشش کریں؟

اس ملک میں غیر مسلموں کا اسلام کے بارے میں تصور صحیح کرنے کی کوئی صورت نہیں رہی، اس کام کی طرف توجہ کم سے کم تر ہے! ہندوستان جیسے ملک میں جس میں متعدد المذاہب قومیں رہتی ہیں اور مسلمان اقلیت میں بھی ہیں، غیر مسلموں کی اسلام ومسلمانوں کے بارے میں جو غلط معلومات ہیں ان کو درست کرنے کی کوشش بہت ضروری ہے اور اسلام کا جو روشن چہرہ ہے اس کو دکھانے کی کوشش کرنا بہت بڑی ذمہ داری ہے، یہ کام دعوت کا بھی ہے اور دعوت کا کام دیگر تمام طریقوں پر مقدم اور ان سے افضل ہے، اس کے بعد دوسرے طریقے آتے ہیں جن کو حسب ضرورت اختیار کیا جاسکتا ہے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف تو مسلمانوں نے وہ تمام اخلاقی اور انسانی کمزوریاں اور برائیاں اختیار کرلی ہیں جو غیر مسلموں میں پائی جاتی ہیں، اور محض مردم شماری کے لحاظ سے مسلمان ہونے پر یہ توقع قائم کیے ہوئے ہیں کہ غیر مسلموں سے ان کے سب اختلافات معرکۂ حق و باطل ہیں اور مقابلہ پڑ گیا تو غزوۂ بدر جیسی مدد ان کے لیے بھی آئے گی، اس وقت افسوسناک صورت حال یہ ہے کہ ہماری سیرت و کردار کمزور، ہماری سنجیدہ کوشش و جد و جہد ناقص، ہماری حکمت عملی غیر مدبرانہ، ہمارے جذبات بے قابو، ہمارا تعلق مع اللہ مشکوک اور غیروں میں ہمارا تصور خراب ہے، ایسی صورت میں صرف طلاقتِ لسانی اور گرم لہجے اور گرم مظاہروں سے کہاں تک کام چل سکتا ہے؟ ہمارا کام سنجیدگی کے ساتھ موقع ومحل کا لحاظ کرتے ہوئے، حکمت عملی اختیار کرنے، اپنے کردار کو درست کرنے اور نرم گرم دونوں موقعوں کے لیے حضور سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں اجتماعی زندگی کے مختلف النوع حالات سے نمٹنے کی جو سنت رہی ہے اس کو اختیار کرنے سے ہی چلے گا، اس حقیقت کو ہمارے قائدین کو بھی سمجھنا ہے اور عام مسلمانوں کو بھی سمجھنا ہے!

کفن بردوش جا پہنچے مگر.....

بلال عبدالحی حسنی ندوی

دنیا کو دین سے جس طرح اسلام نے جوڑا ہے اس کی مثال کسی مذہب میں مل سکتی، ایک طرف وہ رہبانیت کو پسند نہیں کرتا اور دوسری طرف اس نے دنیا کو دین کے سانچہ میں ڈھال کر پیش کیا ہے، دنیا برتنے کا سلیقہ بتایا ہے لیکن دل کے رخ کو درست رکھنے کی تلقین بھی کی ہے، زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ لوگ خالی ہاتھ حج کے لیے آتے تھے اور کچھ ساتھ لینا حج کے مزاج کے خلاف سمجھتے تھے، اسلام نے اس جاہلی رسم کو مٹادیا اور حکم دیا کہ "تزوّدوا" (توشۂ راہ لے لیا کرو)، مکہ پہنچ کر دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا اسلامی مزاج کے خلاف ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جو لوگوں سے سوال کرے گا وہ قیامت میں چہرے پر کھروچوں کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ اس کا حکم دیا گیا کہ اپنی ضروریات خود پوری کرو، کسی پر بوجھ نہ بنو، ایک طرف "تزودوا" (توشۂ راہ لے لیا کرو) کا حکم ہے اور دوسری آیت میں دل کے رخ کو درست کیا جارہا ہے اور اصل چیز کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے، ارشاد ہوتا ہے: "فإن خیر الزاد التقویٰ" (تقوی بہترین توشۂ راہ ہے)۔

حقیقت میں یہ انسان اس دنیا میں راہ آخرت پر ہے، اور اس کے لیے سب سے بہتر توشۂ تقوی اور پرہیزگاری ہے، حج کا سفر ایک عظیم اور بامقصد سفر ہے، اس میں مشقتیں بھی پیش آتی ہیں، مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے، ضرورت زندگی کی تکمیل بھی اہم ہے لیکن دیکھا جائے تو اس سفر میں اس سے زیادہ ان صفات کو اختیار کرنا ہے جو حج کے لیے مطلوب ہیں، یہ بابرکت سفر جب پوری تیاری کے ساتھ ہوگا تو اس کے نتائج ہی کچھ اور ہوں گے۔ آج موجودہ سہولتوں نے ذہنوں کو فارغ کردیا ہے، لوگ بغیر کسی تیاری کے نکلتے ہیں اور گھنٹوں میں یہ سفر سہولت کے ساتھ طے ہوجاتا ہے، بعضوں کو وہاں پہنچ کر اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے اور بعض جا کر واپس بھی آجاتے ہیں لیکن وہ کچھ محسوس ہی نہیں کر پاتے اور رسمی طور پر ایک فریضہ کو اپنی گردن سے اتار کر چلے آتے ہیں، نہ ان کی زندگی میں تبدیلی ہوتی ہے اور نہ خود ان کو اس کا خیال ہی رہتا ہے کہ یہ سفر سفرِ زندگی کے نئے آغاز کا ایک ذریعہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب توشۂ سفر لینے کا حکم دیا گیا اور یہ بھی اس لیے تاکہ وہ کسی پر بوجھ نہ بنے تو فوراً ہی تقوی اور پرہیزگاری کی راہ بھی بتادی گئی کہ سفر زندگی میں اس سے بڑھ کر اور کوئی توشۂ راہ نہیں اور آدمی حج میں جب کفن بردوش اپنے مالک کے دربار میں حاضر ہورہا ہے تو اس سے بڑھ کر اور کون سا توشہ ہوسکتا ہے جو ہر جگہ اس کے کام آئے۔

ہر ماحول کے لوگ ہیں، اچھے بھی ہیں اور برے بھی، نرم مزاج بھی اور سخت دل بھی، غصہ پی جانے والے بھی ہیں اور بات بات پر غصہ کرنے والے بھی، ایسے ماحول میں اگر مزاج تقوی کے رنگ میں رنگا ہوا نہیں ہے یا کم از کم اس کے کچھ اثرات دل پر نہیں پڑے ہیں تو انسان گھاٹے میں ہے، اس کا خطرہ ہے کہ وہ بجائے پانے کے کھو کر نہ آئے۔

مزاج پر قابو، دل کی حفاظت، نگاہوں کی حفاظت: یہ وہ چیزیں ہیں جن کی وہاں لحہ لحہ ضرورت پیش آتی ہے، بہتر ہے کہ سفر حج سے پہلے اس کی مشق شروع کردی جائے تاکہ یہ سفر تقوی اور پرہیزگاری کا سفر ہو اور وہاں کا لحہ لحہ یادگار بن جائے۔

احرام کی چادریں حقیقت یاد دلاتی ہیں، انسان اپنے مالک کے دربار میں بے سروسامان حاضر ہے، سراپا عجز وانکسار، ندامت کے آنسو لے کر غفور و رحیم کی چوکھٹ پر مغفرت کا طلبگار بن کر آیا ہے، کہیں سے اپنی بڑائی کا احساس نہ ہو ورنہ یہ احرام کی چادریں بے حقیقت ہیں، بقول شاعر

ع کفن بردوش جا پہنچے مگر مرنا نہ سیکھا تھا

اگر وہاں جا کر بھی اپنے بے مائیگی کا احساس نہ ہو، اپنی حقیقت سمجھ میں نہ آئے تو کیا ملا؟!

ایک زمانہ تھا کہ حج کسی جہاد سے کم نہ تھا، بڑی صعوبتوں کے بعد لوگ پہنچتے تھے، کتنے راستے میں جام شہادت پی لیتے تھے! مہینوں کا سفر ہوتا تھا، موسم کی سختیاں، رسد کی قلت، راستوں کا پرخطر ہونا، ایک عام بات تھی۔ ایک حاجی حقیقت میں اپنے گھر سے کفن بردوش ہوکر نکلتا تھا، ہر ایک کے حقوق ادا کرکے، معافی تلافی کرکے، اپنے ذہن ودماغ کو ایک کام کے لیے یکسو کرلیتا تھا، اس کو بس ایک دھن ہوتی تھی کہ کسی طرح دیار حبیب پہنچ کر دل کو سکون اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچائے، آتش شوق ایسی تیز بھڑکتی تھی کہ سردی گرمی کا احساس جاتا رہتا تھا، کتنے اللہ کے بندے برداشت نہ کرسکے، حجاز مقدس کی سرزمین پر نگاہ پڑی تو وفور شوق میں جان دے دی!!

آج سب خواب ہوگیا، مادیت اس حد تک غالب آتی جارہی ہے کہ حج و عمرہ کے سفر کو بھی لوگوں نے تفریح کا سامان بنالیا ہے، نہ وہ شوق رہا نہ وہ تڑپ رہی، منٹوں اور گھنٹوں کا سفر، پہلے سے تیاری کی فرصت نہیں! بقول عربی ادیب کے "وقت بچ گیا لیکن جذبات سرد پڑ گئے"۔

بار بار یاد کرنے کی ضرورت ہے کہ اللہ نے کہاں پہنچادیا، جو جگہ رحمت الٰہی اور عنایات ربانی کا مرکز ہو، جہاں لحہ لحہ انوار وتجلیات کا نزول ہوتا ہے وہاں سے آدمی خالی ہاتھ واپس آجائے، اس سے بڑھ کر محرومی اور کیا ہوسکتی ہے؟!

اس کے لیے ضرورت ہے پہلے سے تیاری کرنے کی، دل کی سرد انگیٹھی کو گرم کرنے کی، اپنی سابقہ زندگی کا جائزہ لینے کی، توشۂ تقوی کو سفر زندگی میں اختیار کرنے کی، حرم محترم کے تقدس و پاکیزگی کے استحضار کی مدینہ طیبہ کے ذرہ ذرہ سے محبت پیدا کرنے کی اور حرمین شریفین سے عشق ووارفتگی پیدا کرلینے کی۔

زائر جب زیارت کے آداب سے واقف ہوگا اور اس کی رعایت رکھتے ہو، قدم بڑھائے گا تو قدم قدم پر اس کو رحمتیں ملیں گی، بخششوں کا سامان ہوگا اور واپس آتے آتے وہ اس طرح آئے گا کہ گویا آج ماں کے پیٹ سے صاف صاف ستھرا پیدا ہوا ہے اور اس کا حج مبرور ہوگا۔ اس کے لیے خوش خبری ہے "الحج المبرور لیس له جزاء الا الجنة" حج مبرور کا بدلہ جنت کے سوا کچھ نہیں۔

قرآن کریم کا تصور مال

عبدالسبحان ناخدا ندوی

مال کے تعلق سے قرآن کریم کچھ اصولی ہدایات دیتا ہے، جن کی بنیاد پر مال کو ٹھیک ٹھیک خرچ کیا جاسکتا ہے، قرآن کریم سب سے پہلے یہ تصور دیتا ہے کہ مال اللہ کا فضل ہے، انسان کا ذاتی کمال نہیں، فساد کی جڑ انسان کا یہ تصور ہے کہ جو مجھے ملا ہے وہ میرا ذاتی کمال ہے، جس کے نتیجہ میں کنجوسی وجود میں آتی ہے اور مال میں جمود پیدا ہوتا ہے، قرآن یہ تصور بخشتا ہے کہ مال اللہ کا فضل ہے، اس لیے اسے خوب خرچ کیا جائے، اور ان تک ممکن حد تک پہنچایا جائے جو اس سے محروم ہیں، زکوٰۃ، صدقات، عطیات وغیرہ اسی کی قسمیں ہیں، اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ چونکہ مال اللہ کے فضل سے حاصل ہوا ہے (یہی صحیح بھی ہے ورنہ دنیا کا سب سے مالدار شخص سب سے زیادہ ذہین، عقلمند، محنتی اور تعلیم یافتہ ہوتا، جب کہ ایسا نہیں ہے) اس لیے اس کا خرچ کرنا ہی دراصل اس کی حقیقی منفعت ہے، اور یہی مال کے اضافہ کا ذریعہ بھی ہے، اس کا صاف اعلان ہے: "**وما أنفقتم من شئ فهو يخلفه**" (تم جو بھی خرچ کروگے وہ تمہیں اس کا عوض عطا کرے گا)، البتہ خرچ کرنے میں وہ اعتدال کو پیش نظر رکھنے کی تاکید کرتا ہے، ایسا خرچ اسے پسند نہیں جس کے نتیجہ میں آئندہ ہاتھ پھیلانے کی نوبت آئے: "**ولا تجعل يدك مغلولة الى عنقك ولا تبسطها كل البسط فتقعد ملوماً محسوراً**" (اپنے ہاتھوں کو گردن کی طرف لے جا کر باندھ نہ دو، نہ ان کو بالکل کھلا چھوڑ دو، پھر یہی ہوگا کہ حسرت سے آہیں بھرتے، اپنے آپ کو ملامت کرتے بیٹھے رہوگے)، مال کے حصول کے لیے وہ گداگری کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اپنی محنت کی کمائی کھانے پر اس نے زور دیا ہے، پوری زمین انسان کے لیے ہموار کردی گئی ہے تاکہ اس کے سینے پر وہ تگ و دو کرکے اللہ کا دیا ہوا کھائے: "**هو الذى جعل لكم الأرض ذلولاً فامشوا فى مناكبها وكلوا من رزقه**"، اس کا صاف اعلان یہ ہے: "**واسئلوا الله من فضله**" () بچوں کے ہاتھ مال دینا اسے پسند نہیں، اس سے خرابیاں پھیلتی ہیں، اولاد کی صحیح تربیت کے لیے ضروری ہے کہ ان کے ہاتھ میں "مال" جیسی نازک چیز نہ دی جائے، یہ دو دھاری تلوار ہے، اور کچی عمریوں بھی ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھتی ہے، چاہے انگارہ ہی کیوں نہ ہو، البتہ ان کو فراغت کے ساتھ کھلانے پلانے کا حکم قرآن کریم نے دیا ہے تاکہ بچے کسی قسم کے احساس محرومی کے ساتھ پروان نہ چڑھیں، "**ولا تؤتوا السفهاء أموالكم التى جعل الله لكم قياماً وارزقوهم فيها واكسوهم وقولوا لهم قولاً معروفاً**" (نادانوں کو اپنا مال نہ دو جس مال کو اللہ نے تمہارے لیے زندگی قائم رکھنے کا ذریعہ بنایا ہے، اسی مال میں سے ان کو کھلاؤ پہناؤ، اور ان سے بھلی بات کہتے رہو) یعنی ان کی طرف سے بے جا ضد ہو تو خوش اسلوبی کے ساتھ معاملہ کو نمٹا دو۔ معیشت کو سنبھالنے کے لیے قرآن کریم نے یہ بھی اصول مرحمت فرمایا کہ کبھی اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانے کی کوشش نہ کی جائے، یہ خواہش انسان کو بہت ذلیل کرتی ہے، کبھی قرض مانگنا پڑتا ہے، کبھی ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے، اور بسا اوقات اس خواہش میں اندھا بہرا ہو کر انسان مکاری اور ظلم کے اوچھے ہتھکنڈوں کو اختیار کرتا ہے اور اپنی دنیا و عاقبت برباد کرتا ہے، قرآن کریم کا صاف ارشاد ہے: "**لينفق ذو سعة من سعته و من قدر عليه رزقهٗ فلينفق مما آتاه الله، لا يكلف الله نفساً الا ما آتاها سيجعل الله بعد عسرٍ يسراً**" (وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور جسے قدرت کی طرف سے کم رزق ملا ہو تو جتنا اللہ نے دیا ہے اسی میں خرچ کرے، کسی انسان کو اللہ نے اس کی گنجائش سے زیادہ کا پابند نہیں کیا ہے۔ (اس حکم پر عمل پیرا ہوگے تو) عنقریب اللہ تعالیٰ تنگی کے بعد فراخی کا دور بھی دکھائے گا)۔ اوپر والی آیت میں "**وارزقوهم فيها**" کہا گیا ہے، یعنی اپنے مال کے دائرے میں رہ کر ان کو کھلاؤ۔ لفظ "فی" یہاں نظام معاش کا یہ اصول فراہم کر رہا ہے کہ خرچ آمدنی کے دائرے کے اندر ہو، اس دائرہ کو ہرگز پار نہ کیا جائے، یہی خودداری ہے۔

موجودہ نظام معیشت کو انسانی آبادی کی فکر بہت ستاتی ہے، رات دن بیچارے مادّی انسان اسی فکر میں گھلے جا رہے ہیں (یہ ہم نے محاورتاً لکھا ہے، ورنہ کسی مادی پرست کو ہم نے انسانیت کی فکر میں گھلتے ہوئے نہیں دیکھا ہے، اور امید ہے کہ آئندہ بھی نہیں دیکھیں گے) کہ آبادی اس قدر بڑھ جائے گی تو پھر معیشت تباہ ہو جائے گی، اور انسان فاقوں سے مرنے لگیں گے، یہ ایک بچکانہ طرز فکر ہے، جس کا حقیقت کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں، قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ ہمیشہ اللہ کا رزق کھانے والوں سے زیادہ رہا ہے، ذرا اس آیت پر غور کریں: "**هو الذي جعل لكم الأرض ذلولاً فامشوا في مناكبها و كلوا من رزقه**" (اسی اللہ نے تمہارے لیے زمین کو ہموار کیا لہٰذا تم اس کی پشت پر چلو پھرو اور اس کے رزق میں سے کھاؤ)، "**كلوا من رزقه**" یہ چھوٹا سا ٹکڑا ماہرین اقتصادیات کی مہارت پر سوالیہ نشان قائم کر رہا ہے، "اس میں سے کھاؤ" اسی وقت کہا جاتا ہے جب کھانا ضرورت سے بہت زیادہ ہو، اللہ کا یہ اعلان تمام انسانوں کے لیے ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے، قرآن کریم کے اعلانات وقتی نہیں ہوتے، اس آیت نے قرآنی تصور اقتصاد کی ایک عظیم بنیاد فراہم کردی، وہ یہی کہ رہتی دنیا تک رزق ہمیشہ انسانی ضرورتوں سے زیادہ ہی پایا جائے گا، تاریخ کی روشنی میں اس اصول کا جائزہ لیا جائے تو یہی معلوم ہوگا کہ قحط کے زمانوں کو چھوڑ کر کہ وہ انسانوں کے لیے قدرت کی آزمائش ہوتے ہیں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ پیداوار حسب معمول ہوئی ہو اور انسانوں کے لیے غذائی قلت کا مسئلہ پیش آیا ہو، جب بھی یہ مسئلہ پیش آیا ہے وہ انسانوں کی اپنی حرص، مفاد پرستی اور مصنوعی بھوک کی وجہ سے پیش آیا ہے کہ ایک طرف غریب ملک فاقہ کشی کا شکار ہو کر مرتے رہے، دوسری طرف امیر ملکوں کے گودام میں اناج کے انبار سڑتے رہے، انسانوں کی اس سفاک حماقت کا الزام قدرت کے سر کیوں ڈالا جائے؟

یاد رکھنے کی بات ہے کہ انسان اپنے گرد و پیش سے اس قدر متاثر رہتا ہے کہ اس سے اوپر اٹھ کر سوچ ہی نہیں پاتا، یہ اللہ کا کلام ہے جو انسان کو اتنا اونچا اٹھاتا ہے کہ وہ ہر معاملہ کو بصیرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور کنویں کا مینڈک بنا نہیں رہتا، اللہ کی رزاقی کا ایک خاص یقین قرآن کریم پیدا کرتا ہے، جس سے مادی محدود آنکھیں کھل جاتی ہیں اور انسان اپنی تنگ نظری کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ فرض کیجیے آج سے ہزار سال پہلے جب دنیا کی کل آبادی شاید چار یا پانچ کروڑ سے زیادہ نہ ہوگی

شراب کی اقسام
اوران کے شرعی احکام

مفتی راشد حسین ندوی

اسلام کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے تمام پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیا ہے، اور تمام نقصان دہ، مضر، اخلاق خراب کرنے والی، معاشرہ پر برا اثر ڈالنے والی چیزوں پر پابندی لگادی، اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**یأمرھم بالمعروف و ینھٰھم عن المنکر و یحل لھم الطیبٰت و یحرم علیھم الخبٰئث و یضع عنھم إصرھم و الأغلال التی کانت علیھم**" (اعراف: ۱۵۷) (وہ حکم کرتا ہے ان کو نیک کام کا اور منع کرتا ہے برے کام سے، اور حلال کرتا ہے ان کے لیے سب پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ان پر ناپاک چیزیں اور اتارتا ہے ان پر سے ان کے بوجھ اور وہ قیدیں جو ان پر تھیں)۔ پھر بھلا اسلام میں شراب جیسی چیزوں کی گنجائش کیسے ہوسکتی تھی جس کے ام الخبائث یا تمام برائیوں کی جڑ ہونے پر تمام قومیں متفق ہیں؟ چنانچہ اسلام نے اس پر سختی کے ساتھ پابندی لگائی، اور پابندی ایسے مؤثر ڈھنگ اور خوبصورت انداز میں لگائی کہ عرب جیسی قوم شراب جس کی گھٹی میں پڑی تھی اور جو نشہ کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کرسکتی تھی اس نے یک لخت اس سے کنارہ کشی کرلی، اور اس گئی گزری حالت میں بھی مسلمانوں کی اکثریت آج بھی اس لت سے محفوظ ہے، یہ اسلام کے زندہ معجزوں میں سے ایک معجزہ ہے، ورنہ بہت سی حکومتیں اور ریاستیں شراب کی مضرتیں دیکھ کر اس پر پابندی لگاتی ہیں، پھر لوگ چوری چھپے شراب پیتے ہیں، زہریلی شراب پینے کے چند المناک واقعات پیش آتے ہیں، پھر حکومت نہ صرف ممانعت کا حکم واپس لینے پر مجبور ہوجاتی ہے بلکہ اس کو ٹیکس وغیرہ کے حصول کا ذریعہ بنالیتی ہے، اس قسم کا سب سے دلچسپ واقعہ امریکہ میں پیش آیا تھا جس کو صاحب ''مقالات سیرت'' اور صاحب کتاب ''تنقیحات'' نیز دوسرے حضرات نے نقل کیا ہے کہ امریکہ میں انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں شراب کے نقصانات اور معاشرہ پر پڑنے والے اس کے برے اثرات کے سبب شراب پر مکمل پابندی کا فیصلہ کیا گیا، عوام کا شعور بیدار کرنے کے لیے اس زمانہ کے وسائل اخبارات رسائل لیکچرس ڈراموں سینما وغیرہ کا بھرپور استعمال کیا گیا، اس پر تقریباً ساٹھ ملین ڈالر کا خرچ آیا، تقریباً دس بلین صفحات اشتہاری مہم میں استعمال کیے گئے، سیکڑوں لوگ گرفتار اور ملک بدر کیے گئے، کروڑوں ڈالر کا جرمانہ لگایا گیا اور نہ معلوم کتنی جائدادوں کی ضبطی ہوئی لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات، اس سے امریکیوں کی شراب نوشی میں مزید اضافہ ہوا اور کچھ عرصہ بعد بالآخر یہ قانون واپس لینا پڑا۔

اس کایا پلٹ کی علت جہاں اسلام کی صداقت، قرآن کی سحر بیانی اور آنحضرت ﷺ کی دلآویز اور لوگوں کے قلوب ونفوس کو مٹھی میں لے لینے والی اور مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ لینے والی شخصیت تھی، وہیں اس میں اس حکمت تدریج کا بھی دخل تھا جس کو دوسرے احکام ہی کی طرح شراب کی ممانعت کے وقت بھی پیش نظر رکھا گیا تھا، چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد بھی لوگ شراب پیا کرتے تھے، پھر اس کی مضرتیں دیکھ کر صحابہ کرام نے آنحضرت ﷺ سے شراب کا حکم دریافت کیا، اس لیے کہ دوسرے احکام کا تقاضہ یہ تھا کہ مضرتوں کے پیش نظر شراب پر بھی پابندی ہو، چنانچہ قرآن میں اس سوال کا جواب اس طرح درج کیا گیا ہے: "**ویسئلونک عن الخمر و المیسر، قل فیھما إثم کبیر و منافع للناس، و إثمھما أکبر من نفعھما**" (البقرۃ: ۲۱۹) (یعنی لوگ شراب اور جوئے سے متعلق آپ سے دریافت کرتے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ ان دونوں چیزوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے کچھ منافع بھی ہیں اور ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑھ کر ہے)۔

اس آیت میں قطعی حرمت نازل نہیں کی گئی، البتہ حرمت کے پہلو کو راجح قرار دیا گیا، صحابہ کی ایک بڑی تعداد نے اسی آیت کے نزول کے بعد شراب کی لعنت سے توبہ کرلی لیکن جو لوگ اس کے خوگر اور عادی تھے وہ اب بھی اس کا استعمال کررہے تھے، حکمت تدریج اپناتے ہوئے اب اس سلسلہ میں دوسرا حکم یہ نازل ہوا کہ حالت سکر میں نماز نہ پڑھی جائے: "**یا أیھا الذین آمنوا لا تقربوا الصلوۃ و أنتم سکاریٰ حتی تعلموا ما تقولون**" (سورۃ النساء: ۴۳) بتایا جاتا ہے کہ اس آیت کا شان نزول یہ تھا کہ ایک شخص نے نشہ کی حالت میں نماز میں سورہ کافرون پڑھی اور "اعبد ما تعبدون" پڑھ دیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ اے کافرو! جس کی عبادت تم کرتے ہو میں بھی اسی کی عبادت کرتا ہوں، اس پر مندرجہ بالا آیت ممانعت نازل ہوئی۔ اس آیت کے نزول کے بعد اب شراب پینے کے اوقات محدود ہوگئے، اس لیے کہ شراب کے اثرات دیر تک رہتے ہیں، لہٰذا اب ظہر سے عشاء تک تو گویا شراب پینا ممکن ہی نہیں تھا، صرف عشاء بعد یا فجر بعد پینا ممکن تھا، پھر فجر بعد مشغولیات کا وقت تھا تو مشغول لوگوں کے لیے تو گویا صرف عشاء بعد ہی کا وقت رہ گیا تھا، اس طرح شراب کے عادی لوگوں کو بھی اس کے قریب جانے کا زیادہ موقع نہیں رہ گیا تھا، پھر جب اس پر پورا عمل ہوگیا تو آخر میں ضرب کاری لگاتے ہوئے قطعی ممانعت کا حکم نازل ہوا، ارشاد فرمایا: "**یا أیھا الذین آمنوا إنما الخمر و المیسر و الأنصاب و الأزلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ.....الآیۃ**" (سورۃ المائدہ: ۹۰) (اے ایمان والو! یہ جو ہے شراب اور جوا اور بت اور پانسے سب گندے کام ہیں شیطان کے، سو ان سے بچے رہو تا کہ نجات پاؤ)

اس آیت کریمہ میں شراب کو گندا کام، اور شیطانی عمل کہا گیا، اس سے بچنے کا حکم دیا گیا، اور نجات کا دارومدار اسی سے پرہیز کو قرار دیا گیا، گویا اس سے بچنے کے لیے ایک ہی آیت میں متعدد اسلوب اپنائے گئے اور کئی ڈگریاں لگائی گئیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس حکم کو اپنے متعدد ارشادات میں مزید وضاحت سے بیان فرمایا، ایک موقع پر ارشاد فرمایا: ''بدکاری کرنے والا بدکاری اس حال میں کرتا ہے کہ وہ مومن نہیں ہوتا اور شراب پینے والا شراب اس حال میں پیتا ہے کہ وہ مومن نہیں ہوتا'' (بخاری، مسلم) ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''شراب کے متعلق دس لوگوں پر لعنت کی گئی ہے: (شیرہ بنانے کے لیے) نچوڑنے والے پر، نچوڑنے کا حکم دینے والے پر، پینے والے پر، اٹھا کر پہنچانے والے پر، اس شخص پر جس کے پاس اٹھا کر لے جائے، پلانے والے پر، بیچنے والے پر، اس کی قیمت کھانے والے پر، خریدنے والے پر، جس کے لیے خریدی جائے اس پر'' .(ابن ماجہ، ترمذی)

اگر کوئی یہ کہتا کہ ایک زمانہ وہ آئے گا جب آبادی دوسو گنا بڑھ کر آٹھ ارب تک پہنچ جائے گی تو اس وقت کے تمام ماہرین اقتصادیات متفقہ طور پر یہ ''اقتصادی فتویٰ'' جاری کرتے کہ ایسی صورت حال پیش آئی تو آبادی کا دسواں حصہ صرف زندگی بسر کرنے کے لائق رہے گا، بقیہ نو حصہ تو ایک ایک لقمہ کو ترستے ہوئے جان دے دیں گے، لیکن آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ کارخانۂ رزق سے اسی طرح رزق رواں دواں ہے، ہر ایک اپنے حصہ کا رزق کھا رہا ہے بلکہ ممکن ہے کہ اگلوں سے اچھا اور زیادہ کھا رہا ہے، بالکل اسی طرح آج کے ''معاشی دانشور'' یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ دنیا کی آبادی آئندہ چل کر آٹھ کھرب ہو جائے تب بھی لوگ فارغ البالی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں گے، ماحول کے قیدی یہ بھی ویسے ہی ہیں جس طرح ہزار سال پہلے کے ماہرین تھے (اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ ماہرین کی قسم کی کوئی مخلوق اس وقت بھی تھی)۔

مادی انسان کا سکڑا سمٹا ذہن قرآنی ہدایت کے بغیر وہ آفاقیت پیدا کر ہی نہیں سکتا کہ گردوپیش سے اوپر اٹھ کر کچھ سوچ سکے، قرآن اسی سکڑے ہوئے مادی ذہن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: **''قل لو أنتم تملكون خزائن رحمة ربي إذاً لأمسكتم خشية الإنفاق و كان الإنسان قتوراً''** (آپ کہیے- اگر تم لوگ میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تب بھی خرچ ہونے کے اندیشے سے (خزانوں کے خزانے) روکے رکھتے، انسان نہایت تنگ دل واقع ہوا ہے)۔

نظام معیشت میں تین طرح سے ناہمواری پیدا ہوتی ہے، کنجوسی، حرص اور اسراف، قرآن کریم ان بیماریوں کو جڑ سے اکھاڑنے کی دعوت دیتا ہے، کنجوسی ایک نفسیاتی مرض ہے، یہ اپنے اوپر ظلم کرنا ہے، جو اپنے مال سے خود ہی فائدہ نہ اٹھا سکا اس سے بڑا احمق کون ہو سکتا ہے؟! (واضح رہے ہم یہاں انفاق فی سبیل اللہ کی بحث کو قصداً پیش نہیں کر رہے ہیں، وہ تو انسانیت نوازی کی سب سے اعلیٰ ترین شکل ہے، یہاں ہم عام انسانی ذہن کو پیش نظر رکھ کر وہ معاشی تصور پیش کر رہے ہیں جو قرآن کا عطا کردہ ہے)۔

اسی طرح حرص بھی حقیقت میں ایک ذہنی مرض ہے، یہ بیٹھے بٹھائے اپنے آپ کو پریشان رکھنے کا نام ہے۔ فرض کیجئے، دو شخص یکساں معاشی پوزیشن رکھتے ہیں، ایک اپنی زندگی پر مطمئن ہے، یا جائز طریقہ سے ترقی کرنے کی کوشش کرتا ہے اور دوسرا ہر ایک کی جیب پر نظر رکھتا ہے، اور پیسے کا نام آتے ہی اس کی رال ٹپکنے لگتی ہے، ان میں کون نارمل (Normal) زندگی گزار رہا ہے اور کون ایب نارمل (Abnormal) ہے بتانے کی ضرورت نہیں، بخیل و حریص کے لیے قرآنی پیغام یہ ہے: **''و من يوق شح نفسه فأولئك هم المفلحون''** (جو اپنے دل کی حرص اور بخل سے محفوظ رہے وہی درحقیقت مکمل کامیاب ہیں)، دنیا میں مطمئن زندگی، اور صحیح صاحب ایمان ہو تو آخرت میں اللہ کی رضا مندی، انسان کو اور کیا چاہیے؟!

تیسری چیز اسراف ہے، یہ مصنوعی خوشیاں خریدنے کا نام ہے، یہ کاغذی پھول آخر کیا خوشبو دیں گے، بیساکھیوں کے سہارے کیا کوئی اپنے قد و قامت کو بلند کر سکا ہے! دنیا زبان سے کہے یا نہ کہے، دل سے اس کا یقین رکھتی ہے کہ ہزاروں روپئے نام و نمود میں خرچ کرنے والے لکھ پتی سے وہ معمولی انسان بہتر ہے جو اپنی محدود آمدنی میں بھی کچھ پس انداز کر کے کسی یتیم کے آنسو پونچھتا ہے، کسی بھوکے انسان کے پیٹ کی آگ بجھاتا ہے یا کسی بیوہ کے سر پر آنچل اوڑھاتا ہے، قرآن کہتا ہے: **''و آت ذا القربىٰ حقهٗ و المسكين و ابن السبيل و لا تبذر تبذيراً، إن المبذرين كانوا إخوان الشياطين و كان الشيطان لربه كفوراً''** (رشتہ دار کو اس کا حق دو، مسکین کو اس کا حق دو، راہ چلتے مسافر کو اس کا حق دو، بے حساب الٹے سیدھے مال خرچ نہ کرو، غلط سلط مال خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا سب سے بڑا ناشکرا ہے)۔

بقیہ : شراب کی اقسام اور اس کے شرعی احکام

پھر شراب کی تمام اقسام پر پابندی لگائی گئی، اور اس کی کم اور زیادہ مقدار کے استعمال میں کوئی فرق نہیں کیا گیا، چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ''ہر نشہ آور حرام ہے، اور جس کا ایک فَرَقٌ (ایک پیمانہ کا نام) نشہ پیدا کرتا ہو، اس کا ایک چلو (معمولی مقدار) بھی حرام ہے''، حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ہر نشہ آور چیز خمر (شراب) ہے، اور ہر خمر حرام ہے'' (ابوداود، مسند احمد)

بخاری اور مسلم میں روایت آئی ہے کہ حضرت عمرؓ نے مسجد نبوی میں آنحضرت ﷺ کے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: ''امابعد! لوگو! شراب کی حرمت نازل ہوئی ہے، اور یہ پانچ چیزوں سے بنتی ہے: انگور، کھجور، گیہوں، شہد اور جو، اور ہر وہ چیز شراب (کے حکم میں) ہے جو عقل پر خمار طاری کرے''۔

اس آخری جملہ سے واضح ہو گیا کہ ان پانچ چیزوں کا نام بھی تحدید کے لیے نہیں لیا گیا ہے، بلکہ ان کا ذکر وہاں کے عرف کے پیش نظر ہے، اسی لیے بعض دوسری روایات میں مکئی اور دوسری چیزوں کا بھی ذکر ملتا ہے، خلاصۂ کلام یہ ہے کہ شراب چاہے جس چیز سے بنائی جائے اگر وہ نشہ آور اور خمار پیدا کرنے والی ہے تو خمر کے حکم میں ہے، اور اگر اس کی کم مقدار نشہ آور نہیں ہے لیکن زیادہ مقدار سے نشہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا ایک گھونٹ استعمال کرنا بھی حرام ہوگا۔

ان تفصیلات سے معلوم ہو گیا کہ آج جتنی بھی شراب کی اقسام رائج ہیں، خواہ وہ انگریزی شراب ہوں جیسے برانڈی، جن، وہسکی وغیرہ یا دیسی ہوں جیسے مہوے وغیرہ سے بنایا جانے والا 'دارو'، یہ سب قطعی طور پر حرام ہیں، علماء نے جدید تحقیقات کی روشنی میں لکھا ہے کہ جن میں شراب کا جوہر ''الکحل'' خواہ معمولی مقدار میں ملا ہوا ہو خمر کے حکم میں ہے اور حرام ہے۔

بیئر اور تاڑی کا حکم: بہت سے نوجوان اس غلط فہمی میں رہتے ہیں کہ بیئر شراب کے حکم میں نہیں ہے، اس لیے کہ اس کے استعمال سے نشہ نہیں ہوتا، لیکن مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی نے کتاب الفتاوی میں اور سید سابق مرحوم نے فقہ السنہ میں لکھا ہے کہ اس میں ''الکحل'' کی کچھ مقدار ہوتی ہے، لہٰذا دوسری شرابوں کی طرح بیئر بھی شراب ہے، کسی کے بہکاوے میں نہیں آنا چاہیے۔

جہاں تک تاڑی کا تعلق ہے تو اگر وہ نشہ آور ہو جائے تو اس کا استعمال کرنا ناجائز ہوگا، لیکن نشہ آور ہونے سے پہلے اس کا استعمال کیا جا سکتا ہے، تجربہ کار حضرات کا کہنا ہے کہ سورج نکلنے سے پہلے اگر اتار کر استعمال کر لیا جائے تو نشہ نہیں آتا، بہرحال تاڑی کے سلسلہ میں حرمت کی علت نشہ ہے، تجربہ کاروں سے رجوع کر کے اور معلومات کر کے ہی اس کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم

کھیل کے میدان سے زندگی کے میدان تک

جعفر مسعود حسنی ندوی

اگر آپ سے کوئی یہ سوال کرے کہ کیا خیال ہے آپ کا ان حضرات کے بارے میں جنہوں نے اپنی زندگی میں کبھی کرکٹ گراونڈ کا رخ نہیں کیا، جنہوں نے ہاتھ میں کبھی کرکٹ کا بلا نہیں پکڑا، جنہوں نے کرکٹ کی گیند چھونے کی کبھی کوشش نہیں کی، جنہیں پچ میں ہونے والی تبدیلیوں کا کوئی علم نہیں، جنہیں پتہ نہیں کہ پچ کے نم ہونے اور سوکھنے کا کیا اثر پڑتا ہے، جنہیں اندازہ نہیں کہ موسم سے کرکٹ کتنا متاثر ہوتا ہے، جنہیں معلوم نہیں کہ تیز اور سرد ہواؤں سے گیند باز کو کیا فائدہ پہنچتا ہے، لیکن جہالت کے اس سمندر میں غوطہ لگانے کے باوجود ایک چھوٹے سے چائے خانہ میں، لکڑی کی ایک ٹوٹی ہوئی بنچ پر، ہونٹوں میں ادھ جلی بیڑی دبائے وہ تبصرہ کر رہے ہوں، لارڈس کے میدان میں کھیلے جارہے کرکٹ ورلڈ کپ کے فائنل میچ پر اور نشانہ بنا رہے ہوں ٹیم کے کپتان کو اپنی جارحانہ تنقیدوں کا تو یقیناً آپ اپنی نرم مزاجی کے باوجود یہ کہنے پر مجبور ہوں گے ''بے وقوفوں کی کمی نہیں غالب ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں''، کیوں کہ تنقید کا حق صرف اس شخص کو حاصل ہے جو اس کھیل کے تمام شعبوں سے پوری طرح واقف، اس کی نزاکتوں سے پوری طرح آگاہ، اور اس میں لمحہ بہ لمحہ ہونے والی تبدیلیوں کو پوری طرح سمجھتا ہو۔

کسی میچ کو جیتنے کے لیے تنہا کپتان کی ذہانت ومحنت اور تیزی وچالاکی کافی نہیں، اگر ٹیم کے دوسرے ممبران کپتان کا ساتھ نہ دیں، اگر بلے باز لمبا اسکور کرکے ٹیم کو مضبوط پوزیشن میں نہ لائیں، اگر گیند باز اپنی نپی تلی گیند بازی کرکے مخالف ٹیم کو کم سے کم رنوں پر روکنے کی کوشش نہ کریں، اگر فیلڈر چست فیلڈنگ کا مظاہرہ کرکے گیند نکالنے کے تمام راستوں پر پہرہ نہ بٹھادیں، تو کپتان اپنی تمام تر ذہانت ومحنت، لیاقت وصلاحیت، عزم وحوصلہ، لگن وولولہ اور جوش وجذبہ کے باوجود شکست سے دوچار ہوگا۔

یہ بات تو تھی ایک کھیل کی، جس کا دائرہ بڑا محدود، جس میں حصہ لینے والوں کی تعداد بڑی مختصر اور جس کی مدت چند گھنٹوں کی یا زیادہ سے زیادہ پانچ روز۔

اب آیئے اس کھیل کی طرف جو کھیل پوری زندگی کا ہے، ذرا غور کیجیے اس تعداد پر جو اس کھیل میں حصہ لے رہی ہے، ذرا اندازہ لگایئے اس رقبہ کا جس میں یہ کھیل کھیلنے کی کوشش کی جارہی ہے، ان مشکلات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے جن مشکلات سے آپ دوچار ہیں، ان طاقتوں پر نظر ڈالیے جو آپ کے وجود کو مٹانے کے درپے ہیں، دوسروں کو چھوڑیئے اپنا ہی جائزہ لیجئے، آپ ہی میں کتنے ہیں جو آپ ہی کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں، اور دانستہ یا نادانستہ دشمن کا ساتھ دے کر آپ کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں لگے ہیں۔

یہ امت مسلمہ ایک ٹیم ہے اور یہ کائنات ایک گراونڈ، اور صرف ایک ٹیم نہیں بلکہ مختلف ٹیموں کا ایک مجموعہ ہے جو سازشوں کا جال اور مکر وفریب کا ہتھیار لے کر مقابلہ پر موجود ہے۔ آپ کی یہ ٹیم روانہ کی گئی تھی خیر کی دعوت دینے کے لیے، بے انصافی، ظلم اور خدا کی نافرمانی سے روکنے کے لیے، ظلم کی طاقتوں کو کچلنے کے لیے، توحید کو عام کرنے اور الحاد پر روک لگانے کے لیے، غلط رجحانات، خود ساختہ نظریات، اور تخریبی عناصر سے اس سرزمین کو پاک کرنے کے لیے۔

اس ٹیم کا کام تھا باطل طاقتوں کے بڑھتے قدموں کو روکنا، ان کے نقصانات سے اس کائنات کو بچانے کی کوشش کرنا، ان کی ناپاک کوششوں اور مذموم ارادوں کو پنپنے کا موقع نہ دینا اور اسلام کے سدا بہار درخت کی جڑ بلکہ ایک ایک شاخ، ایک ایک پھول اور ایک ایک پتہ کی اپنی جان سے زیادہ حفاظت کرنا، اس مقابلہ میں اس ٹیم کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے اسلامی تعلیمات کی شکل میں ہم کو ایک قائد بھی عطا کیا تھا، حضور پاک ﷺ جب دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے یہ ارشاد فرما گئے ہیں: ''میں تمہاری رہنمائی کے لیے دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں، اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہنا، کبھی گمراہ نہ ہوگے۔'' اب ہمیں چاہیے تھا کہ اپنے اس قائد کی رہنمائی میں مقابلہ کے اس میدان میں اترتے، اور اس کی رائے پر چلتے ہوئے کسی اچھے نتیجہ کا انتظار کرتے، لیکن ہم نے اس کے برخلاف زندگی کے اس سنجیدہ اور فیصلہ کن مقابلہ میں وہ طریقہ اپنایا جو کھلاڑی نہیں تماشائی اپنایا کرتے ہیں، ہم نے مقابلہ کی نزاکتوں کو سمجھنے، اس کے تقاضوں کو پورا کرنے، اس کے لیے صحیح لائحہ عمل تیار کرنے کی کوشش نہیں کی، ہم نے اپنے کو اس مقابلہ کے میدان کا کھلاڑی نہیں سمجھا، بلکہ ہماری حیثیت اس پورے مقابلہ میں محض ایک تماشائی کی سی رہی جو مقابلہ کے میدان میں آتا تو ضرور ہے لیکن کھیلنے کے لیے نہیں دیکھنے کے لیے، دوڑنے کے لیے نہیں بیٹھنے کے لیے، کوشش کے لیے نہیں تفریح اور لطف اندوزی کے لیے، اور جب مقابلہ ختم ہوجاتا ہے اور جیت کے بجائے ہار کا سامنا ہوتا ہے، تو وہ اپنا سارا غصہ ان لوگوں پر اتارتا ہے جنہوں نے کسی نہ کسی حیثیت سے اور کچھ نہ کچھ حصہ اس مقابلہ میں ضرور لیا ہوتا ہے، اور دوسروں کا ساتھ نہ ملنے کی وجہ سے انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے، لیکن دوسرے ان پر الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے محنت نہیں کی، وہ پیسے لے کر مقابلہ ہار گئے، ان میں جذبہ کا فقدان تھا، سوجھ بوجھ کی کمی تھی، ہمت ان کی پست اور لگن ان میں مفقود تھی، ان کا انتخاب جس نے کیا غلط کیا، اب ان کو ہٹا کر دوسروں کو لانا چاہیے، اور دوسروں کو قیادت کا موقعہ دینا چاہیے۔

اس طرح یہ آنا جانا لگا رہتا ہے، اور تماشائیوں کی تماش بینی کا یہ سلسلہ اور اس کے بعد کا ان کا یہ تبصرہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔

یا پھر ہماری حیثیت اس کھلاڑی کی سی ہوتی ہے، جو کپتان کے پیچھے نہیں آگے چلنے کی کوشش کرتا ہے، وہ اس کی ہدایات کو اختیار نہیں کرتا، اس کے مشوروں کو تسلیم نہیں کرتا اور اس کے دیے ہوئے حکموں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دیکھا دیکھی ہر شخص من مانی شروع کردیتا ہے اور اس طرح یہ ٹیم انتشار، بدنظمی اور انارکی کا شکار ہوکر ہر محاذ پر ناکام ہوجاتی ہے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے اتنی عمدہ، متوازن اور باصلاحیت ٹیم اور پھر پے درپے کی یہ ہار؟! یاد رکھیے کہ اجتماعی کام میں کھیل ہو یا محاذ جنگ جیتنے کے لیے، صرف توازن، صلاحیت اور اہلیت کافی نہیں، بلکہ جیت حاصل کرنے کے لیے کچھ اور چیزوں کی بھی ضرورت پڑتی ہے، اور وہ ہیں: باہمی ربط، آپسی اعتماد، انتھک جدوجہد اور قائد کی ہدایات کی پوری پابندی اور اس کی قیادت پر بھروسہ۔

اب جس دن بھی ہماری ٹیم میں توازن، صلاحیت اور اہلیت کے ساتھ ربط اور اعتماد پیدا ہوجائے گا اور شریعت کی رہنمائی میں مقابلہ کے لیے میدان میں اترا جائے گا تو ہر مقابلہ اس کے لیے آسان اور ہر دشمن اس کے آگے سرنگوں ہوگا!

امریکی افواج
خود کشی کا بڑھتا رجحان

محمد نفیس خاں ندوی

اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ جنگ کسی بھی مسئلہ کا دیرپا حل نہیں، اور آج کے اس دور میں جنگ ایک انتہائی مہنگا اور دشوار ترین فعل (Task) ہے، کسی بھی جنگ میں یومیہ اربوں ڈالر کا خرچ سیکڑوں انسانی جانوں کے علاوہ ہے، ان کا کسی بھی ترقی پذیر ملک کے لیے برداشت کرنا بہت مشکل ہے، لیکن کوئی ملک ان مضمرات کے باوجود جنگ جیسے مہنگے کھیل میں کودنے کو تیار ہے تو یقیناً اس کے اہداف ان سے بہت بلند اور خفیہ ہیں جو لوگوں کے سامنے ظاہر کیے جاتے ہیں، اور اس بات کو بھی سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی کہ جو ضیاع اس جنگ میں ہو رہا ہے اس کئی گنا زیادہ اس ملک کے وسائل پر قابو پا کر حاصل کیا جا سکتا ہے جس پر یہ جنگ مختلف الزامات لگا کر تھوپی گئی ہے۔ اس پس منظر میں اگر یہ کہا جائے کہ عراق اور افغانستان پر جنگیں امریکہ کی جانب سے زبردستی تھوپی گئی ہیں تو بے جا نہ ہوگا، کیونکہ جن الزامات کو بنیاد بنا کر لشکر کشی کی گئی تھی ان میں سے ایک بھی درست ثابت نہیں ہوا اور جو اہداف مقرر کیے گیے تھے ان کے حصول کا کہیں ذکر ہی نہیں۔

اوباما انتظامیہ کا ماننا ہے کہ افغانستان میں ناقابل فتح جنگ لڑنے کے لیے مزید پینتالیس ہزار فوجی درکا ہیں جو طالبان کی نہ رکنے والی پیش قدمی کا سامنا کر سکیں، کانگریس کی ریسرچ کمیٹی نے یہ واضح کیا ہے کہ افغانستان کی آٹھ برس کی جنگ میں اب تک ۲۲۳ بلین ڈالر خرچ کیا جا چکا ہے، ۲۰۰۳ء تک ۹۸۲ ملین ڈالر کا تخمینہ تھا جو اس سال کے بعد ۹ء۳ بلین تک پہنچ جائے گا، اس زبردست صرفہ کا نتیجہ ہے کہ امریکہ کو نہ صرف یہ کہ زبردست مالی دباؤ برداشت کرنا پڑا بلکہ وہ تاریخ کے بدترین معاشی بحران سے بھی دوچار ہوا، جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان جنگوں کے پیچھے امریکہ کے عزائم ''بہت بلند'' تھے۔

لیکن امریکہ اس وقت جس صورتحال سے دوچار ہے اس کا اس کو گمان بھی نہیں تھا، ان جنگوں نے اسے کوشدید کڑھن اور آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے، مالی طور پر اٹھنے والے اخراجات اپنی جگہ، اب امریکی فوجیوں نے عراق اور افغانستان کی تعیناتی کا حکم ماننے سے بھی انکار کرنا شروع کر دیا ہے، جس کی وجہ وہاں کی عمومی صورت حال، غیر معمولی دباؤ، اور اب تک کسی خاص کامیابی کے حاصل نہ ہونے کی وجہ سے سخت نفسیاتی الجھن ہے، جس کے نتیجہ میں زبردستی سکون حاصل کرنے کی خاطر نشہ آور نیند کی گولیوں کا استعمال عام ہے۔ اب تک شدید تناؤ، نفسیاتی بیماریاں اور عدم اطمنان کی کیفیات ان فوجیوں میں عام تھیں، مگر حالیہ برس میں فوجیوں کی خودکشی کے بڑھتے ہوئے رجحان نے امریکی انتظامیہ کو خاصا پریشان کر رکھا ہے۔

گذشتہ پانچ سالوں میں خودکشی کے رجحان میں خاصی شدت پیدا ہوئی ہے، اس سے قبل ۹۰-۱۹۹۱ء میں گلف وار کے دوران تقریباً ۱۰۲ فوجیوں نے خود کشی کی تھی جو کو تاریخ کی سب سے تشویشناک شرح تھی، لیکن افغان و عراق کی جنگ میں یہ شرح کئی گنا بڑھ گئی ہے، خود امریکی اداروں کی رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۵ء میں ۸۷ فوجیوں نے خودکشی کی، ۲۰۰۶ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۹۹ تک پہنچ گئی، ۲۰۰۸ء میں خودکشی کی شرح تاریخ کے بلند ترین سطح پر پہنچ گئی اور پینٹاگن نے ۱۲۸ کی تعداد درج کی، جبکہ ان میں ان واقعات کو شامل نہیں کیا گیا ہے جن کے بارے میں یہ یقینی نہیں تھا کہ یہ اموات اقدام خودکشی کا نتیجہ ہیں یا کسی اور وجہ سے۔ پینٹاگن کے ترجمان نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ ۹۰ فیصد التوا کا شکار یا غیر یقینی کیس بعد میں خودکشی ہی ثابت ہوتے ہیں۔

افغانستان میں جنگی فریضہ ادا کر کے وطن واپس آنے کے بعد تقریباً بیس فیصد فوجی ذہنی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں، اس سے قبل ۱۹۶۰ء کی دہائی کے اخیر میں جنگ ویتنام سے لوٹنے والے فوجیوں کو بھی اس قسم کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، امریکی سپاہیوں نے جب خود اپنے ساتھیوں کی وحشیانہ کارروائیاں دیکھیں تو وہ نفسیاتی عوارض کا شکار ہو گئے، نفسیاتی عوارض دردسر بن جاتے ہیں لیکن اس سے دردسر کی گولیاں کھا کر نجات حاصل نہیں کی جا سکتی۔

امریکی افواج میں خودکشی کا رجحان نیا نہیں ہے، گزشتہ ۲۵ برسوں میں یہ رجحان گھٹتا بڑھتا رہا ہے، اس حوالہ سے ہونے والی تحقیق میں فوجیوں کی خودسوزی کے رجحان کو ایک لاکھ فوجیوں میں فیصد کے حساب سے جانچا جاتا ہے، ۱۹۸۵ء میں یہ تناسب ۸ء۱۵ فیصد تھا جو کہ اس وقت کا بلند ترین تناسب تھا، یہ تناسب ۲۰۰۱ء میں ۱ء۹ فیصد ہو گیا جو کہ خاصا کم اور امریکی انتظامیہ کے لیے حوصلہ بخش تھا، اسی طرح ۱۹۹۳ء میں یہ تناسب ۲ء۱۴ فیصد رہا، لیکن گزشتہ سالوں میں یہ تناسب بڑھ کر ۲ء۲۰ ہو گیا، جس نے امریکی حکام کو تشویس میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس پیچیدہ صورت حال سے نپٹنے کے لیے تاریخ کے طویل ترین اور مہنگہ ترین منصوبہ پر کام شروع کر دیا گیا ہے، اس کے لیے ۵۰/ملین ڈالر کی خطیر رقم مختص کر دی گئی ہے، جس میں فوجیوں میں بڑھتے ہوئے رجحان پر تحقیق کی جائے گی اور فوجیوں کو اس بات کی ٹریننگ دی جائے گی کہ جنگ کی صورتحال میں پیدا ہونے والے اعصابی دباؤ کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟

اب تک کی رپورٹوں سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ عراق و افغان میں تعینات فوجیوں کی خودسوزی کی وجہ وہاں پر مستقل ناکامیوں کا سامنا، مسلسل تناؤ کی کیفیت کا شکار رہنا، وطن اور پریوار سے دوری کا احساس، اپنی نگاہوں کے سامنے دوستوں کی تڑپتی ہوئی لاشوں کو دیکھنا، اور خود کے مستقبل کی گھٹاٹوپ تاریکی ہے۔ یہاں قابل غور پہلو یہ ہے کہ کسی ملک میں فوج میں جن نوجوانوں کی بھرتی ہوتی ہے وہ عام جوانوں سے مختلف ہوتے ہیں، ان کے اعصاب مضبوط اور حوصلے بلند ہوتے ہیں، جس کے لیے حکومت ان کو خاص ٹریننگ بھی دیتی ہے اور ایک بڑا مالی بجٹ اس پر خرچ بھی کرتی ہے، جب ایسی ٹریننگ اور جدید اسلحوں سے لیس ہونے کے بعد ان میں خودکشی کا رجحان ترقی پا رہا ہے تو یقیناً ان کی نفسیاتی حالت اور ذہنی دباؤ کی کیفیت ایک عام انسان کی فہم و ادراک کے تصور سے کہیں بڑھ کر ہے۔

اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ ان فوجیوں کو ایسے دشمن کا سامنا ہے جن کے بارے میں انھیں صرف یہ پتہ ہے کہ وہ عراق یا افغان میں موجود ہیں، ان کے پاس ان کی شناخت کے لیے کوئی طریقہ نہیں ہے، چنانچہ جب وہ گلیوں میں گشت کر رہے ہوتے ہیں تو انھیں اس بات کا یقین نہیں ہوتا کہ سامنے والا شخص ملک کا عام باشندہ ہے یا امریکہ کا ''مطلوب دہشت گرد''۔ کسی واضح دشمن سے لڑنا آسان ہوتا ہے لیکن دشمن کی آس یا واہمہ پر گلی گلی چکر لگانا خاصا دشوار اور مشکل کام ہے، جس کے نتیجہ میں دشمن ملے یا نا ملے مگر دشمن کی تلاش میں سرگرداں فوجی ضرور نفسیاتی تناؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ حالات و قرائن اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ امریکہ کا انجام سوویت یونین سے مختلف نہیں ہوگا، لیکن امریکہ کو کون سمجھائے؟!